خالد ہمایوں

# آغا شورش کاشمیری پر تحقیق مزید

کوئی اڑھائی تین ہفتے قبل میں ایک پی ایچ ڈی مقابلہ بعنوان: ''آغا شورش کاشمیری بحیثیت صحافی'' پر کالم لکھ کر فارغ ہوا تھا کہ اگلے روز اتفاق سے جناب راشد مجازی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ آج کل ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' کے مدیر ہیں ان کے ہاتھ میں عبدالستار چودھری کی کتاب ''غیروں کی جیلیں اپنوں کی جیلیں'' دکھائی دی۔ یہ کتاب میری نظر سے ابھی تک نہیں گزری تھی۔ اس میں پاکستانی صحافت و سیاست سے وابستہ کئی شخصیتوں کے ایام اسیری کی سرگزشتیں شامل ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے ورق گردانی کی تو معلوم ہوا کہ ایک باب آغا شورش کے احوال زنداں پر رقم کیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد آغا شورش صاحب کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ وہ پاکستانی صحافیوں کی صف اوّل کی کھیپ میں اس حوالے سے ممتاز ترین صاحب قلم تھے، جنھوں نے تحریک آزادی میں سب سے زیادہ قید و بند کے مرحلے دیکھے تھے۔ تقسیم کے بعد بھی وہ حق گوئی اور بیباکی کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ قدرت نے انھیں انشاء پردازی کا ملکہ بھی عطا کر رکھا تھا۔ ان کی وفات (اکتوبر ۱۹۷۵ء) تک ان کے طرز انشاء کے مداحوں کا ایک وسیع حلقہ قائم رہا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ باقاعدہ طور پر کسی جماعت سے وابستہ نہ تھے۔ لیکن جب کوئی حکومت ان پر جیل کے دروازے کھولتی یا ان کے رسالے ''چٹان'' پر پابندی لگاتی اور پریس ضبط کر لیتی تو پورے ملک میں احتجاج کی ایسی زبردست لہر اٹھتی کہ حکومت اپنے جھوٹے مقدمے واپس لے کر انھیں رہا کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ آغا صاحب کو تمام سیاسی، صحافتی اور دینی حلقوں میں احترام حاصل تھا۔ خطابت کے حوالے سے انھیں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا سچا جانشین تصور کیا جاتا تھا۔ شاہ صاحب نے جرأت اظہار کی پاداش میں جتنی قید کاٹی اس بارے میں ان کا یہ کہنا عین امر واقعہ تھا کہ ''میری آدھی عمر جیل میں اور آدھی ریل میں کٹ گئی''۔

عبدالستار چودھری نے اپنی کتاب میں آغا صاحب کے احوال زنداں ۲۷ صفحات میں بیان کیے ہیں۔ لیکن ایک تو واقعات کے انتخاب اور پیشکش میں کسی اچھے ذوق کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دوسرے حالات و واقعات بیان کرتے ہوئے احتیاط نہیں برتی۔ ماخذ تو آغا صاحب کی اپنی تحریریں ہی ہیں جو سب دستیاب ہیں۔ ان سے قید و بند کے شدائد کی تفصیلات لیتے ہوئے ضروری تھا کہ ہر واقعہ کا پس منظر اور پیش منظر ٹھیک ٹھیک نظر کے سامنے رکھتے۔ ایسا محسوس نہ ہوتا کہ کتاب کے فاضل مرتب نے ایسے ہی چند اقتباسات اٹھا کر جوڑ جاڑ دیئے ہیں۔ قاری پڑھے تو کم از کم کچھ تاثر تو قبول کرے۔ آغا صاحب کی انشاء پردازی سے بھی لطف اندوز ہو اور ان پر گزرنے والے مصائب و آلام پڑھ کر اس کے احساس کی دنیا میں تموج بھی پیدا ہو۔ چودھری صاحب اس زاویے کو نظر انداز کر گئے ہیں۔

رہ گیا حقائق کا بیان تو اس حوالے سے وہ کئی مقامات پر ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ لکھتے ہیں ''جبکہ ۱۹۴۹ء سے شورش کی وفات تک ''چٹان'' تیس مرتبہ بندش کا شکار ہوا اور بیس مرتبہ شورش گرفتار ہوئے'' حالانکہ آزادی کے بعد آغا صاحب پر چار دفعہ افتاد آئی۔ پہلی بار دولتانہ وزارت نے انھیں چند دن قید رکھا اور ''چٹان'' پر پابندی لگا دی۔ آغا صاحب اس کی جگہ ہفت

روزہ ''عادل'' شائع کرتے رہے۔ دوسری دفعہ ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء کو ڈی پی آر کے تحت گرفتار ہوئے۔ انھوں نے ۴۰ر دن منٹگمری جیل (ساہی وال) اور ۱۰۰ر دن لاہور میو ہسپتال میں نظر بندی کے گزارے۔ ان کی کتاب ''تمغہء خدمت'' انھی ایام کے دلگداز سرگزشت ہے۔

۲۲ر اپریل ۱۹۶۸ء کو ''چٹان'' کا شمارہ ضبط ہوا اور ۲۵ر اپریل کو ڈیکلریشن منسوخ ہوگیا۔ پریس پر بھی پابندی لگادی گئی۔ ۵ر مئی کو آغا صاحب نے جمعیت علمائے اسلام کے کنونشن کے آخری اجلاس میں حکومت کے خلاف تقریر کی جس کی پاداش میں ۷ر مئی کو انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ الزام یہ لگایا کہ انھوں نے ''چٹان'' میں جو شذرہ ''الحمدللہ'' کے عنوان تلے لکھا ہے وہ مسلمان فرقوں میں تفریق کا باعث بن سکتا ہے اصل میں وہ شذرہ مرزائیوں کے خلاف تھا۔ آغا صاحب کو ڈیرہ اسماعیل خان کی جیل میں رکھا گیا جہاں انھوں نے ۲۲ر دن بھوک ہڑتال کی۔ یہ قید ۲۳۲ دنوں پر مشتمل تھی۔ اس قید کی تفصیلات ان کی کتاب ''موت سے واپسی'' میں موجود ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی دسمبر ۱۹۷۱ء میں برسراقتدار آئی تو اس نے انھیں ۲۲ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو گرفتار کیا اور ۱۴ر جنوری ۱۹۷۳ء کو رہا کردیا۔ آخری دفعہ انھیں تحریک ختم نبوت (۱۹۷۴ء) کے دوران گرفتار کیا گیا یہ زمانہ اسارت ۲۹ر مئی سے ۲۷ر جولائی تک ہے۔ مصنف نے تقسیم سے قبل کی قید وبند کے واقعات کی جامع تصویر پیش نہیں کی حالانکہ اس وقت کی قید کے شدائد آزادی کے بعد کے دور سے کہیں زیادہ پر مصائب تھے۔ انگریز حکومت نے انتہا اس طرح کی کہ گندگی کا توبرا بنا کر ان کے منہ پر باندھ دیا۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند سید عطاء المومن کہا کرتے ہیں: مجھے یوں لگتا ہے آغا مرحوم نے اس ظالمانہ اقدام پر جس غیر معمولی صبر وثبات کا مظاہرہ کیا وہ ان کی مغفرت کے لیے کافی ہوگا۔

ایک جگہ مصنف نے دو واقعات کو اچھا خاصا گڈمڈ کردیا ہے۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ جب انھیں بطور قیدی گجرات سے لاہور لانے کے لیے ریل میں سوار کرایا گیا تو اتفاق سے اس ڈبے میں دو نوجوان لڑکیاں اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بڑی لڑکی جس کا نام خورشید تھا کے دل میں آغا صاحب کے لیے الفت کا جذبہ پیدا ہوا۔ جس کی تپش دو طرفہ تھی، کوئی سال بھر آغا صاحب کو وہاں تعلق خاطر رہا۔ خورشید کی والدہ شادی پر رضامند تھیں لیکن شومئ قسمت سے آغا صاحب سال بھر کے لیے جیل چلے گئے واپس آئے تو معلوم ہوا خورشید ٹی بی کی شکار ہوکر وفات پا چکی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں آغا صاحب کی شادی ان کے ماموں کی بیٹی سے ہوئی۔ اتفاق سے اس کا نام بھی خورشید تھا۔ مصنف محترم آغا صاحب کی زبانی روایت اس طرح درج کرتے ہیں: ''کہتے ہیں کہ رشتے آسمانوں میں ہی طے ہوجاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہتھکڑیوں میں دیکھنے والی ریل ڈبے میں بیٹھی ایک عام سواری میرے سامنے بیٹھی خورشید ہی تو تھی جو میری رفیق زندگی بننے والی تھی۔ ۱۹۳۹ء کو جب رہا ہوا تو پھر وہی خورشید میری رفیق حیات بنی''۔

جناب عبدالستار چودھری کو چاہیے کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں تصحیح کرلیں تاکہ کتاب کا اعتبار بھی بن جائے اور آغا صاحب ایسے بطل جلیل کے بارے میں بے بنیاد باتیں بھی راہ نہ پائیں۔ بلاشبہ وہ ملت اسلامیہ کے قابل فخر فرزند تھے (مطبوعہ: روزنامہ پاکستان لاہور، ۱۳ر نومبر ۲۰۱۴ء)